جلد۱۰شمارہ۱۶، ۲۰۲۳

Article

Psychological Trends in 21st Century Urdu Fiction

اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں نفسیاتی رجحانات

Qudrat Ullah Khan*[1], Dr. Sattar Khan Khatak[2], Dr. Syed Zubair Shah,[2]

[1] Ph.d Scholor,Adabyat e Urdu, Qurtaba University, Peshawar.
[2] Qurtaba University, Peshawar.
[3] Qurtaba University, Peshawar.
*Correspondence: saher.mobeen@gcwus.edu.pk

[1] قدرت اللہ خان، ڈاکٹر ستار خاں خٹک، [2]ڈاکٹر سید زبیر شاہ[3]

[1] سکالر پی ایچ ڈی ادبیات اردو، قرطبہ یونیورسٹی، پشاور، [2]قرطبہ یونیورسٹی، پشاور، [3]قرطبہ یونیورسٹی، پشاور

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:02-03-2023
Accepted:04-04-2023
Online:30-06-2023

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract:The 21^{ST} century saw a rise in popularity of Urdu short stories. Straightforward, storytelling made the text thrive. The terrorist attack on the Twin Towers and the beginning of the twenty-first century; this catastrophe had an impact on world politics and culture. The global terrorism problem had an impact on numerous countries. Many countries, like Pakistan, have grappled with instability, confusion, and uncertainty as prime targets of terrorism. To survive, the current "Urdu short story" must reflect contemporary themes. The circumstances also led to widespread psychological problems. This clarifies the powerful experience of psychological phenomena like panic, dread, and lack of identity, loneliness, alienation, and social suffocation in the "Urdu short story." Contemporary Urdu short stories feature characters that are affected by a range of mental illnesses, such as schizophrenia, sadism, masochism, Transvestism, paraphilia, pedophilia, nostalgia, and others.

Key words: Anarchism, disorder, anxiety, isolation, social suffocation. Psychological disorders, nostalgia, masochism, hostility, loneliness

اکیسویں صدی کی ابتدا ہی سیاسی انتشار سے ہوئی اور نائن الیون کا دل دوز واقعہ پیش آیا جس نے پوری دنیا کو متاثر کیا اور دنیا کے سیاسی و سماجی منظر نامے پر ایک نئے باب کا آغاز ہوا جس نے دہشت گردی، انتہا پسندی اور تشدد کو فروغ دیا۔ اس تمام تر صورت حال نے کئی ممالک جیسے پاکستان، عراق، افغانستان اور لیبیا سمیت دوسرے ملکوں کو بیرونی اور اندورنی جنگ میں دھکیل دیا۔ گلوبلائزیشن، مشینی دور، مادی دوڑ، نئی اور پرانی نسل کا ذہنی تصادم، نئی اور پرانی تہذیب کا تصادم، ریپ کے انسانیت سوز واقعات، موبائل اور انٹرنیٹ کا غلط استعمال، عوام کا سیاسی استحصال، جنسی ہیجان انگیزی، ہم جنس پرستی، تانثیت، مسلکی، لسانی، ملکی، نسلی اور علاقائی تعصب، تغیرات، جوہری ہتھیاروں کا رجحان، تیسری عالمی جنگ کا خطرہ، مذہبی شدت پسندی، مذہب بے زاری وغیرہ جیسے عوامل نے انسان کو بے شمار مسائل سے دوچار کر دیا۔ ان عوامل نے خوف، عدم برداشت، ذہنی انتشار، بیگانگی، تنہائی، بے حسی، جنسی بے راہ روی، عدم تحفظ، عدم شناخت، گھٹن، مایوسی اور بے چینی سمیت دوسرے سماجی و نفسیاتی مسائل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اردو افسانے نے اس کا اثر لیا اور یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کے افسانے میں نفسیاتی رجحانات کی بہتات ہے۔ جدید افسانہ نگار رمز و ایمائیت، علامت، اور فلسفیانہ لب و لہجے کے ذریعے نفسی حقیقت کو بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "افسانہ نگار کے گردو پیش میں تجربات، مشاہدات اور حوادث بکھرے ملتے ہیں۔ وہ بعض نفسی کیفیات کے زیر اثر اپنے تنقیدی ذوق کی امداد سے ردو قبول کے بعد چند امور کو اپنا موضوع بناتے ہوئے بعض سے چشم پوشی کرتا ہے۔ مواد کا انتخاب سراسر نفسی کیفیات اور لاشعوری محرکات کے تابع ہوتا ہے البتہ اس کی پیش کش شعوری ہوتی ہے۔"[1]

افسانوی ادب اور نفسیات کے باہمی روابط میں خصوصاً فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نظریات نے افسانے کو نیا پن عطا کیا اور اس صدی کا افسانہ نگار نفسیاتی رجحانات، نفسی کیفیات، اسلوب اور تکنیک میں علم نفسیات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ علم نفسیات ہی کی وجہ سے افسانے کو نئی اصطلاحات اور نئے نظریات و رجحانات جیسے تحلیل نفسی، شعور، لاشعور، اجتماعی لاشعور، کمتری الجھاؤ، ناسٹیلجیا، آر کی ٹائپ، آزاد تلازمہ خیال، ایڈی پس کمپلکس، الیکٹرا کمپلکس, شعور کی رو، داخلیت، خارجیت، مساکیت، سادیت، نرگسیت، وجودیت، اظہاریت، خودکلامی، شائی زوفرینیا اور جنسیت وغیرہ ملے ہیں۔ نئے افسانے میں ادیب نے خارج سے داخل اور داخل سے خارج تک کا سفر کیا ہے۔ ادیب انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا اثر قبول کر کے تخلیقی عمل میں بروئے کار لاتا ہے۔

> "فرائیڈ اور دیگر معاصرین نفسیات کی مانند ژونگ بھی ادب اور نفسیات میں گہرے رابطے کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ تخلیق، تخلیق کار، تخلیقی عمل کی تفہیم میں اور تحلیل و تشریح کے لیے نفسیات کو کامیابی سے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔"[2]

اکیسویں صدی میں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی کھیپ نظر آتی ہے۔ یہاں ان سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے چند مخصوص نفسیاتی رجحانات کا مختصر اً ذکر کیا جاتا ہے:

خوف ایک نفسیاتی رویہ ہے اور اس صدی کا سب سے بڑا خوف دہشت گردی کا پیدا کردہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دہشت گردی کی لہر نے خاص کر اس خطے کو بہت متاثر کیا لیکن اس کا خوف پوری دنیا میں پھیل گیا۔ نائن الیون کے سانحے کے بعد امریکی جنگی جارحیت نے عراق کے بعد افغانستان اور لیبیا کو نشانہ بنایا تو اس کی وجہ سے، خوف اور عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا، عرب ممالک میں بیداری اور بغاوت کی تحریکوں نے عالمی سطح پر بے چینی میں اضافہ کیا۔ پاکستان اور افغانستان کے اندر کئی تنظیموں نے حکومتی رٹ کو چیلنج کیا، سکولوں، بسوں، اڈوں، مسجدوں، امام بارگاہوں، تہواروں اور بازاروں میں خود کش حملوں اور بم دھماکوں نے دائمی خوف وہراس کو فروغ دیا، اور اس کا بھرپور اثر اکیسویں صدی کے افسانے نے قبول کیا۔ خالد محمود سامٹیہ اپنے مقالے "اکیسویں صدی میں اردو افسانے کے نئے موضوعات" میں لکھتے ہیں:

> "اکیسویں صدی میں اردو افسانے کا سب سے بڑا موضوع دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی، شدت پسندی، استعماری جارحیت، قدامت پرستی اور روشن خیالی کی کش مکش رہا ہے ۔۔۔۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے بھی اس سب سے بڑے انسانی مسئلے کی مختلف جہات اور اسباب کو اپنے افسانوں میں داخلی تخلیقی کرب کے ساتھ پیش کیا۔ دہشت گردی کے مختلف عوامل پر ان گنت افسانے تخلیق کیے گئے ہیں ۔"[۳]

نیرّ اقبال علوی نے اپنے افسانے "خارش زدہ کتا" میں شہر کی حالت دکھا کر دراصل معاشرے میں پائے جانے والا عدم برداشت، خوف، معاشرتی بے حسی، دہشت گردی اور انتہا پسندی سے پیدا ہونے والے نفسیاتی مسائل بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اس افسانے کے ذریعے اکیسویں صدی میں در آنے والی معاشرتی بُرائیاں اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں اور خوف وہراس کی بہترین عکاسی چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دہشت گردی کو مذہب سے جوڑا گیا اور ایک مخصوص حلیہ تشکیل دے کر اسے بدنام کیا گیا جس سے دوسرے انسانوں کو خوف محسوس ہونے لگا۔ اسی طرح عبادت گاہوں کو بم دھماکوں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا جس سے نفسیاتی خوف میں مزید اضافہ ہوا کیونکہ مذہب ہی انسان کا واحد سہارا ہے جہاں سے اُسے نفسیاتی اور روحانی خوشی ملتی ہے۔ افسانہ "خارش زدہ کتا" میں اس کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''مسجدوں کے میناروں سے گونجنے والی اذانوں میں قدرت نے اُن کے لیے جو ولولہ انگیز پیغام رکھا تھا اس کو سراسر فراموش کر بیٹھے اس بے لگام اور بے نہار ہجوم نے انسانیت کی تمام اعلیٰ و ارفع اقدار، سنہری روایات کو جاہلیت اور تنگ نظری کے پیروں تلے روند ڈالا ہے۔''[۴]

نیئرّ اقبال علوی کے افسانے "گلوبل ویلیج" میں سمندر پار بھی یہ خوف انسان کا پیچھا کرتا نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں عرب نوجوانوں کی زیر جامہ تلاشی اور پولیس کی طرف سے ناروا سلوک اس بات کا غماز ہے کہ اکیسویں صدی میں دہشت گردی کی لہر کے بعد اہل مغرب مسلمانوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ انھیں انتہا پسند اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ جرمنی میں مسلمانوں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن میں مقامی پولیس کی طرف سے کچھ یوں سلوک کیا جاتا ہے۔

> "اُنھوں نے چُغا اُتارنے کا حکم دیا، اور اُن کو خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر گاڑیوں کے منتظر دیگر مسافروں اور چلتے پھرتے سارے لوگوں کی توجہ اس تماشے کی طرف مبذول ہو گئی، اس کے بعد پولیس والوں نے ان کے جوتے اور جُرابیں تک اُتروا دیں، غالباً اُن کو شُبہ ہوا کہ یہ اُسامہ بن لادن کی جماعت القاعدہ کے تربیت یافتہ دہشت گرد ہیں۔"[۵]

"خالی بٹوہ" محمد حمید شاہد کا افسانہ ہے اس افسانے کا بنیادی موضوع اکیسویں صدی میں دہشت گردی، انتہا پسندی، فرقہ واریت، انتشار اور خوف ہے۔ اس کا مرکزی کردار موجودہ دور کی افرتفری، قتل و غارت اور انارکی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ملتا ہے اور خاص کر اس موقع پر جب عید جیسا مبارک دن ہوتا ہے۔ اس افسانے کی ابتدا ہی اس جملے سے ہوتی ہے: "اب تو عید اور گرتی ہوئی لاشوں کا ایک ساتھ تصور باندھا جا سکتا ہے"[۶]۔

حمید شاہد کے افسانے "خونی لام ہوا قتلام بچوں کا" میں دہشت گردی کے سیاسی، معاشرتی اور خاص طور پر نفسیاتی اثرات واسباب فنی سانچے میں ڈھلے ہوئے ملتے ہیں۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ دہشت گردی کی وجہ سے انسان کا انسان پر سے اعتبار اُٹھ چکا ہے اور معاشرہ اجتماعی طور پر کس قدر دہشت زدہ ہو چکا ہے کہ اس کہانی کا ذہنی معذور بچہ جب دادا کی جیکٹ پہن کر بازار میں لوگوں کو ڈراتا ہے تو اسے دہشت گرد سمجھ کر گولیوں سے بھون لیا جاتا ہے۔

"ابن آدم" خالدہ حسین کا دہشت گردی کے موضوع پر مبنی افسانہ ہے۔ دہشت گردی جو نائن الیون کے بعد پوری دنیا اور بالخصوص ہمارے خطے کا سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔ اس سے نہ صرف تباہی مچی ہے بلکہ اتنی صورتوں میں ہوئی ہے کہ انسانی سائیکی کو بری طرح متاثر کر کے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے اور دائمی خوف نے ڈیرے ڈال دیے ہیں۔

فیصل نواز چودھری کا افسانہ "چار ملین" ناروے میں مقیم پاکستانی کردار کی کہانی ہے۔ راوی کو نائن الیون کے بعد ناروے میں مسلمانوں کے خلاف تعصب کا سامنا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نائن الیون کے بعد تارکین وطن کو نفسیاتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام اور مسلمان کے خلاف نفرت، تعصب اور منفی پروپیگنڈے نے اُن کو ذہنی اذیت اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔

محمد حامد سراج کے افسانے "چھید ہسٹری" کا بنیادی موضوع دہشت گردی سے پیدا ہونے والا Post traumatic stress Disorder ہے۔

Post traumatic stress disorder (PTSD)is a mental health problem that develops in some people who have experienced a shocking ,scary or dangerous event such as war and combat, domestic violence and abuse, natural disasters, or experiencing mass violence.[۷]

اس افسانے کا کردار PTSD میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اُس کا ذہن وال کلاک کی ٹک ٹک سے ٹائم بم اور دھماکوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور آزاد تلازمہ خیال کے ذریعے اُس کے ذہن میں غربت اور کبھی دھماکوں کے واقعات گردش کرنے لگتے ہیں جس میں احمد شاہ مسعود کا فوٹو گرافر کے کیمرے میں نصب بم سے جاں بحق ہونا، کراچی میں بہن اور بہنوئی کے دھماکے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اور اس طرح دہشت گردی سے پیدا ہونے والی دوسری صورت حال شامل ہے۔ یہ کردار مستقل نفسیاتی خوف کا شکار ہے اور یہ خوف پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر بن چکا ہے۔ اُس کا ذہن منتشر ہے اور لاشعور میں خود کش بمبار اور دھماکوں کی گونج ہے جو اس کو بے چین رکھتی ہے اور وال کلاک کی آواز بھی اُسے ٹائم بم کی طرح ڈراتی ہے۔

”کلاک کی سوئیوں کے ساتھ انھوں نے خود کش بمبار کو باندھ دیا۔

ٹک ٹک۔۔۔ٹک ٹک ٹک ٹک۔۔۔یہ وال کلاک کہاں رکھا ہے؟

میرے کمرے میں۔۔۔بھرے بازار میں، کسی سبزی منڈی میں، وکلا کے اجتماع میں، راولپنڈی کی کچہری میں، مہران بیس پر کہاں رکھا ہے۔۔۔؟ یہ جو پیٹرول پمپ سے گاڑی زناٹے سے نکلی ہے اور اب ایک سر، سڑک کے اُس پار دیوار کے ساتھ پڑا ہے۔ سابق آرمی چیف کا سر اُڑاتے اُڑاتے خود اُڑ گیا، یہ وال کلاک ہے کہاں؟“[۸]

”کالی دیواریں" بھی محمد حامد سراج کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ فرقہ واریت، لسانیت کی کش مکش، انتہا پسندی اور تشدد پر مشتمل ہے۔ اس افسانے کا مرد کردار ایک ایسے شہر پہنچتا ہے جہاں فرقہ واریت، لسانیت اور صوبائیت سے پیدا ہونے والے انتشار کا خوف پھیل چکا ہے۔

اسی دہشت گردی کو محمد امین الدین "چیونٹیوں کی طرح مت چیخو" میں نئے رنگ سے افسانے میں ڈھالتے ہیں۔ ان کی نظر میں انسان ان درندوں کے لیے چیونٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک بچے کے دہشت گرد بننے اور خود کش حملہ کرنے تک کے واقعات کو سمیٹا گیا ہے افسانے میں قدم قدم پر تجسس پایا جاتا ہے۔ انھوں نے لمحہ بہ لمحہ خارجی و داخلی اور نفسیاتی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔ اس افسانے کے بارے میں مبین مرزا کہتے ہیں:

"دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں حیات انسانی کی ارزانی کا ایک اہم رُخ محمد امین الدین نے اپنے افسانے "چیونٹیوں کی طرح مت چیخو" میں دکھایا ہے۔"[۹]

سید زبیر شاہ کے افسانے "کفارہ" کا کردار اسی وجہ سے شدید احساس جرم کا شکار رہتا ہے کہ اُس نے مجبوری میں دہشت گردوں کی مدد کی تھی اور اب کفارے کے طور پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتا ہے۔

"ایٹوموسو" محمد جمیل اختر کا افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرد کردار "وہ" کی صورت میں وارد ہوتا ہے۔ اُس کو دھماکے نے خوف کا شکار کر کے ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس دھماکے سے پہلے وہ ایک زندہ دل آدمی کے طور پر مشہور تھا اور اپنی بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔ دھماکے سے پیدا ہونے والا خوف Atomosophobia کہلاتا ہے۔ اس کردار میں Post traumatic stress Disorder پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اس خوف سے لڑ رہا ہے اور اس کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی، سوشل میڈیا اور موبائل نے انسان کی پرائیویسی ختم کر دی ہے اس نے بھی خوف میں اضافہ کیا ہے۔ بیسویں صدی کے تفریحی مشاغل دوسرے تھے موجودہ صدی میں تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ انٹرنیٹ ہے اور اس تفریح کا کوئی نہ کوئی سرا ابتذال سے جڑا ہوتا ہے اس لیے یہ بے شمار نفسیاتی پیچیدگیوں اور جنسی کج رویوں کا باعث بنتا ہے۔

شموئیل احمد کا افسانہ "عنکبوت" بھی انسان کی اس جنسی کج روی کی غمازی کرتا ہے۔ میاں بیوی الگ الگ چیٹ میں برہنہ گفتگو کرتے ہیں ۔ اس غلاظت بھری تفریح کا انجام جب سامنے آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسی گفتگو کر رہے تھے۔ افسانہ "عنکبوت" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "وہ کیفے پہلے بھی جاتا تھا۔ چیٹنگ کی لت وہیں پڑی۔ لیکن وہاں فری محسوس نہیں کرتا تھا۔ خاص کر پرون سائٹ سے پوری طرح لطف اندوز ہونا مشکل تھا۔ لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ہر کوئی جھانکتا کہ کیبن خالی ہے کہ نہیں؟ آخر اس نے کمپیوٹر ہی خرید لیا اور انٹرنیٹ کا کنکشن بھی لے لیا۔"[۱۰]

"جلا کر راکھ کر دینے والی ٹھنڈک" سید ماجد شاہ کا افسانہ ہے۔ اس میں انٹرنیٹ اور خاص کر موبائل سے جنم لینے والے نفسیاتی و جنسی مسائل کو اُجاگر کیا گیا ہے، اس افسانے میں ایک عمر رسیدہ کہانی کار ایک سترہ سالہ لڑکی کے ساتھ "موبائل سیکس" کرتا ہے اور دونوں عالم تصور میں ایک نئی اور خیالی دنیا آباد کرتے ہیں۔ حکیم عبدالرؤف کیانی کا افسانہ "مسڈ کال" بھی موبائل سے پیدا ہونے والی جنسی بے راہ روی پر مبنی ہے۔

عدم تحفظ کا احساس انسان کے داخل میں اس کے خارجی عوامل کا پیدا کردہ ہے، عورتوں میں یہ احساس پدرسری معاشرے کی پیداوار ہے ، مرد کے لیے اجتماعی طور پر انتشار، بے روزگاری اور بھوک و افلاس کا پیدا کردہ ہے۔ مبین مرزا کے افسانے "طلسمی دوڑ" کا کردار محرومیوں۔ بھوک و افلاس اور غربت کی وجہ سے ڈیپریشن کا شکار ہے اور انسانوں کی اس جنگل میں خود کو تنہا اور غیر محفوظ تصور کر رہا ہے۔

> "کبھی دوڑتے دوڑتے اُسے محسوس ہوتا کہ ہو بُری طرح ہانپنے لگا ہے۔۔۔ اتنی بُری طرح کہ اُسے اپنے سینے سے دُھونکنی کی آواز سنائی دیتی۔ آنکھوں میں ، ناک میں اور حلق سے پھیپھڑوں تک دُھواں ہی

دُھواں بھر جاتا۔ کڑوااور گاڑھا دھواں جس سے آدمی کا دم گھٹ جاتا ہے۔ سوچتا کہ اُس کا بھی کچھ ہی
لمحوں میں دم گھٹ جائے گا۔ ""

خواتین میں عدم تحفظ کا احساس اور سماجی گھٹن اکیسویں صدی میں تمام تر جدیدیت کے باجود بڑھتا جارہا ہے۔ یہ معاصر افسانے کا بڑا موضوع ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی مسائل ڈیپریشن اور پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈیس آرڈر جیسی ذہنی بیماریوں کا رجحان بڑھ گیا ہے۔

شاہین کاظمی کا افسانہ "برف کی عورت" اس موضوع پر جذباتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ صدیوں سے عورت کو اسی گھٹن اور عدم تحفظ کے احساس نے ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ محمد امین الدین کا افسانہ "مشرق تیری بیٹی کو" اور "صم بکم عم" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کے کرداروں میں اسی المیے کو لے کر شدید ڈیپریشن اور پی ٹی ایس ڈی کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

"ق" بھی سید ماجد شاہ کا افسانہ ہے جو مکالماتی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ ایک عمر رسیدہ مرد اور لڑکی کے درمیان مکالمہ شروع ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مرد کی نفسیات بلکہ مشرقی معاشرے کے مردوں کی مجموعی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے جو ہمیشہ اپنی عمر سے بہت کم عمر کی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ یہ شادیاں بے جوڑ ہوتی ہیں اور اکثر و بیشتر اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے عورتوں میں سماجی گھٹن مزید بڑھتا ہے۔ مرد ہمیشہ سے خواتین کا استحصال کرتے آئے ہیں اور اس کو اپنی فتح سمجھتے ہیں۔ اس افسانے کا مرد کردار جو عمر میں بہت بڑا بلکہ بوڑھا ہے، ایک لڑکی کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے۔ لڑکی اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کرتی ہے مگر وہ طرح طرح کے مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی حوالے دے کر اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ شناخت کے بحران سے دوچار ہونے کا ذکر کرتا ہے لڑکی خوف زدہ ہو کر اُس کے عقد میں آجاتی ہے۔ اس افسانے سے یہی تاثر اُبھرتا ہے کہ اس معاشرے میں مرد اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورت کو کھلونا بنالیتا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ کا اور بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا افسانہ "پتھر کا جگر" ہے۔ اس افسانے میں مرد کی نفسیات ایک ذہنی مریضہ "رانو"" کے المیے کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے میں ہمارے معاشرے کے مردوں کی اجتماعی نفسیات اور درندگی سامنے آتی ہے جو ذہنی معذور لڑکی کو بھی جنسی تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی نے فاصلوں کو نگل لیا ہے لیکن پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ نجم الدین احمد کے افسانے "فرصت کا پہلا دن" میں ایک ایسے ہی ملازمت سے ریٹائرڈ شخص کے پہلے دن کا ذکر کیا ہے جو اپنوں کی بے توجہی کا شکار ہو کر احساس تنہائی سے مر جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کے افسانے "مسز رخشندہ کریم کی زندگی" کی بیوہ رخشندہ بیوگی اور احساس تنہائی کے کرب سے گزر رہی ہے۔ مسز رخشندہ ڈیفنس کے ایک عالیشان بنگلے میں مقیم تھی وہ پچیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی، اُس نے اپنے تین بچوں کی خاطر دوبارہ شادی نہیں کی۔ بچے بڑے ہو کر امریکہ سدھار گئے اور اب وہ تنہائی اور بیوگی کے عذاب سے گزر رہی ہے۔

تنہائی اکیسویں صدی کا بڑا المیہ ہے جس نے نفسیاتی عارضے کی صورت اختیار کی ہے کہیں یہ جدید ٹیکنالوجی، ہجرت، سوشل میڈیا کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے تو کہیں جنریشن گیپ اور نئی و پرانی اقدار کے تصادم سے جنم لیتی ہے۔

شناخت کا بحران اکیسویں صدی کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس نے عالمی، ملکی، مقامی، اجتماعی اور انفرادی سطح پر فرد کو متاثر کیا ہے۔ شناخت کا بحران فرد کی ذات سے شروع ہوتا ہے اور کائنات میں پھیل جاتا ہے۔ عالمی تسلط اور استعماریت، نیو ورلڈ آرڈر نے شناخت کے بحران کا مسئلہ پیدا کر دیا اور اکیسویں صدی کی تیزی سے بدلتی صورت حال نے بھی فرد کو شناخت کے مسئلے سے دوچار کر دیا۔

مبین مرزا کا افسانہ ''گم شدہ لوگ'' کی فردیت کی تلاش پر مبنی ہے۔ اس کا مرکزی کردار اسم با مسمیٰ رئیس ہے جو ہر مہینے کی آخری تاریخ طوائف 'انجلی' کے ساتھ ہوٹل میں گزارتا ہے۔ اس افسانے میں فردیت کی تلاش ہے۔ رئیس ایسی داخلی شناخت کی تلاش میں ہے جو آزادی پر مبنی ہو، جو کسی خاص رشتے اور اُصول و ضوابط کی متقاضی نہ ہو۔ اکیسویں صدی میں انسانوں کی بھیڑ میں انسان تقسیم در تقسیم ہوا ہے اور مختلف ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اپنی فردیت کھو بیٹھا ہے۔ رئیس اپنی فردیت اور شناخت کی تلاش میں ہے جو کسی رشتے اور تقاضے میں مقید نہ ہو جبکہ انجلی بھی عورت کے روپ میں شناخت چاہتی ہے اور ہمیشہ اُس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔

> "یکبارگی انجلی کا جی چاہا کہ وہ اُٹھ کر رئیس سے لپٹ جائے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے، اُس سے کہے کہ تم صرف ایک بے نام رشتے کی تلاش میں ہو اور میں ایسے ہی بے نام رشتوں میں جیون بتا رہی ہوں، لیکن دکھی ہوں، بے چین ہوں، میں ایک ایسے رشتے کی تلاش میں ہوں جسے میں شناخت کر سکوں، جس کے ذریعے اپنی شناخت حاصل کر سکوں۔"[۱۲]

''بچھڑتی دھوپ'' جتندر بلو کا افسانہ ہے جس میں ایشیائی شناخت کا مسئلہ اور تہذیبی تصادم سامنے آتا ہے۔ اس افسانے میں ایسے والدین کی کتھا ہے جو اپنا مستقبل بنانے اور خوشحال زندگی گزارنے مغرب جا بستے ہیں۔ اُن کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں۔ اس وجہ سے مشرقی والدین کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی ہیں۔ بیٹی نے دوستوں کے ساتھ پارٹیوں میں جانا شروع کر دیا ہے۔ اس کے دوستوں میں انگریز لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ والد کی پریشانی اسی وجہ سے بڑھتی جا رہی ہے لیکن وہ قانوناً اپنی بیٹی کو پابند نہیں بنا سکتا کہ مبادا گھر چھوڑ کر چلی جائے یا بات ماننے سے ہی انکار کر بیٹھے۔ اس افسانے میں ایشیائی شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔ اُن کا ایک اور افسانہ ''چھلاوہ'' بھی ہجرت اور اُس سے جڑے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں تین بنیادی کردار ہیں۔ مرکزی کردار کیلاش جو کہ اس اس افسانے کا راوی بھی ہے، اس کی بیوی ساوتری اور تیسرا اُس کا لندن میں مقیم دوست شنکر ہے۔ ان تینوں کے درمیان وطن سے دوری کے فوائد و نقصانات پر طویل مکالمہ ہوتا ہے۔ ان دونوں کی گفتگو کے دوران جنریشن گیپ، تارکین وطن کو درپیش مسائل، احساس کمتری، ذہنی و تہذیبی تصادم، استحصالی پہلو، احساسِ بیگانگی اور سب بڑھ کر شناخت کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

امجد طفیل کا افسانہ ”ٹھٹھر تا شہر“ نفسیاتی کشمکش کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ اکیسویں صدی کے اُس موضوع پر مبنی ہے جہاں مشینی دور اور جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے رویوں میں سرد مہری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں مرد کردار جو برسوں بعد اپنے شہر میں آتا ہے، خود کو بھرے پرے شہر میں تنہا محسوس کرتا ہے۔ یہ کردار داخلی شناخت کے بحران سے دوچار ہے۔ وہ بھرے شہر میں اپنی اور شہر کی شناخت کھو بیٹھا ہے۔

نیئر اقبال علوی کا افسانہ "گلوبل ویلیج" عالمی سطح پر مشرق و مغرب میں تصادم اور خاص کر عالمی سطح پر مسلمانوں کی شناخت کا بحران اور اُس سے منسوب دہشت گردی کے المیے پر مبنی ہے۔ افتخار نسیم کے افسانے "ناگزیر" کا یتیم بچہ شناخت کے بحران سے دوچار ہے۔

تیزی سے بدلتی تہذیب و تمدن کے ساتھ رویے بھی بدلے ہیں۔ اس لیے قدیم اقدار میں سانس لے کر بڑھنے والوں کو یہ تبدیلی ناگوار گزری ہے اور انسان کی اجتماعی نفسیات پر بُری طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ تبدیلی بہت شدت سے رونما ہوئی اس لیے حساس لوگوں کو یہ تبدیلی ناگوار گزری ہے۔ علی اکبر کا افسانہ "شاہ محمد کا ٹانگہ" اسی تناظر میں لکھا گیا ہے۔ سید زبیر شاہ کا افسانہ "بین کرتی میا" بھی اسی کا نوحہ ہے۔ "دو موہنے" اور "خوف کے کتبے" میں ایک اور نظر سے اسلاف فراموشی، احساس سے عاری نئی تہذیب کی پروردہ مصنوعی رویوں والی نسل پر گہری طنز کی ہے۔ اس کے بارے میں طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

> "دو موہنے" اور "خوف کے کتبے" میں تشخص کی تلاش انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے اور یہ کہانیاں زمانی طور پر کسی ایک وقت سے متعلق بھی نہیں۔ ان افسانوں میں وہ ثنویت دکھائی دیتی ہے جو انسانی فطرت میں ازل سے موجود ہے۔"[۱۳]

جب حالات سنگین ہوں، معاشرے کے اقدار بدلتے ہوں یا فرد کو ناموافق حالات کا سامنا ہو تو وہ ناسٹلیجا کا شکار ہو جاتا ہے۔ یاد نگاری کے ذریعے حالات سے فرار اختیار کر کے آسودگی حاصل کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ نفسیاتی الجھن کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

آغا گل کا افسانہ "بی یانڈ بیٹ" اور امجد طفیل کا افسانہ "پرچھائیں" ناسٹیلجیا کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ہم جنسیت (ہوموسیکچویلٹی) بھی نفسیاتی الجھن ہے اور یورپ میں تو باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر کے قانونی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ اس موضوع پر اکیسویں صدی میں بے شمار افسانے لکھے گئے۔ خاص کر اردو افسانے کے مغربی دریچے میں افتخار نسیم کے افسانے ہم جنسیت کا مینو فیسٹو بن چکے ہیں۔ افسانہ "وہ ایک خط" کا کردار لندن سے گھر خط بھیجتا ہے جس میں اُس کے امریکی دوست کی تصویر کے ساتھ یہ خبر دیتا ہے کہ اُس نے شادی کر لی ہے۔ اس کی والدہ اپنے شوہر کی ہم جنسیت کو فلیش بیک میں لا کر بیٹے کو مبارکباد اور دعائیں بھیجتی ہے کہ شکر ہے اس گھر میں کوئی تو اپنی مرضی سے جیا۔ اس میں موروثی ہم جنسیت کا تصور ہے۔ اس طرح ہم جنس پرستی کے لیے ان کے افسانے "پی نٹ" کی مثال بھی دی جا سکتی ہے۔

اکیسویں صدی کے افسانے میں کردار کے ظاہری خد و خال اور کہانی کی صورت کے بجائے کردار کے باطن میں زیادہ دلچسپی لی گئی ہے، نیا افسانہ نگار کردار کے داخلی کردار اور شخصیت میں دلچسپی رکھتا ہے اس لیے اکثر کردار واحد متکلم میں نظر آتا ہے یا داخلی خود کلامی کی صورت میں افسانے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کرداروں پر فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کے نظریات کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

شہناز شورو کا افسانہ "نفسیاتی عدم توازن کا کرب" ایک شادی شدہ جوڑے کے کرب کی کہانی ہے۔ اس افسانے کی راوی اس کردار کی بیوی شبانہ ہے۔ یہ ایک ایسے گھر کی کہانی ہے جس میں میاں، بیوی اور بیوہ ساس ہے۔ میاں بیوی کے درمیان بیوہ ساس ہے جو اپنے بیٹے کا بہت خیال رکھتی ہے اور بیٹا بھی ہر وقت ماں کی خدمت اور تیمارداری میں رہتا ہے۔ میاں کی یہ عادت اُس کی بیوی کو پسند نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی ازدواجی زندگی بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ وہ دفتر سے آکر بیوی کے پاس آنا چاہتا ہے تو ماں کسی نہ کسی بہانے اپنے پاس روک لیتی ہے۔ وہ اپنی والدہ کے پاس پڑا رہتا ہے اور وہیں کھاتا پیتا ہے۔ اس کردار کے تانے بانے ایڈی پس کمپلیکس سے ملتے ہیں۔ رؤف نیازی اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"افسانہ "نفسیاتی عدم توازن کا کرب" Oedipus complex کی کہانی ہے۔ بیٹا بیشتر ماں کے پہلو میں ہمکتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی منکوحہ کے لیے Non erotic اور Passive ہی رہتا ہے۔ اس کی بیوی شبانہ لے دے کر اس سے ایک بیٹا ہی پیدا کرتی ہے اور پندرہ سولہ سال اپنی ناآسودگی کی خلش کے ساتھ کاٹتی ہے۔"[۱۴]

افتخار نسیم کے افسانے "بالغ آنکھیں" میں جہاں فرائڈ کا نظریہ لاشعور ملتا ہے۔ وہاں اس کا کردار حبیب اللہ اسی لاشعور کی وجہ سے احساس جرم میں مبتلا ہے کیونکہ اس نے ایک چھوٹی بچی کے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی اور یہ احساس جرم اسے اپنی بیٹیوں کی قتل کا مجرم بنا دیتا ہے۔ تحلیل نفسی کے ذریعے اس کی پوری کہانی سامنے آتی ہے۔ یہ واقعہ اس کے لاشعور پر بُرے اثرات مرتب کر چکا ہے کہ جب اُس کی بیٹیاں پیدا ہوتیں تو اُن کی وہیں بالغ آنکھیں ہوتیں اس لیے وہ اُن کے منہ اور ناک پر ہاتھ رکھ کر مار دیتا۔ ان کے افسانے "ناگزیر" کا کردار ایک یتیم بچہ ہے جسے بچپن میں جنسی ہراسگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ یہ ناخوشگوار واقعہ اُس کے لاشعور میں بیٹھ کر خوابوں میں مختلف صورتوں میں بھیس بدل بدل کر آتا ہے۔ اس افسانے میں فرائڈ کے تحلیلِ نفسی کا ادراک ہوتا ہے بلکہ یہ فرائڈین نظریات کا بہترین عکاس ہے۔

اجتماعی لاشعور ژونگ کا پیش کردہ نظریہ ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانے میں یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ امجد طفیل کے ایک افسانے "کھینچے ہے مجھے کفر" میں ایک ستر سالہ دادی جو بچپن میں ہندو تھی مسلمان گھرانے میں پرورش پا کر مسلمان ہوئی لیکن اس کے لاشعور میں ابھی بھی بت اور ہندو تہوار خوابوں کی صورت میں آتے ہیں اور انہی خوابوں کی وجہ سے وہ ابریکشن کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے دوران مریض اپنے ماضی کے ناخوشگوار تجربات کو یاد کر کے شعوری سطح پر لاتا ہے اور اس کے لاشعور سے اُن کی ناخوشگواری دور ہو جاتی ہے۔

"بس ایک خلش اس کے دل میں بار بار سر اُٹھاتی اور اسے بے چین کر جاتی۔ ایسے میں وہ آنکھیں موند لیتی اور کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ اس کے کمرے میں موجود لوگ سمجھتے شاید اس پر غنودگی طاری ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے، مگر کچھ ہی دیر بعد وہ آنکھیں کھول کر سب پر مسکراتے ہوئے نگاہ ڈالتی تو ان کے چہرے پر اطمینان اُبھرتا اور سینے سے سکون کے سانس نکلتے۔"[۱۵]

ژونگ ہاں کا نفسیاتی الجھنوں انیما اور انیمس کی اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"سیدھے سادے الفاظ میں ہم انیما کو کسی مرد کے ان زنانہ خصائص کا مجموعہ قرار دے سکتے ہیں جو نوعیت کے اعتبار سے لاشعوری ہوتے ہیں۔ عورتوں میں لاشعوری مردانہ خصائص کو انیمس کہتے ہیں۔"[۱۶]

اکیسویں صدی کے افسانہ نگار نے کرداروں کا باطن ٹٹولا ہے۔ افتخار نسیم کے دو افسانوں "شبری" اور ٹی وی" کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس کے مرد کرداروں میں زنانہ نفسیاتی کج روی پائی جاتی ہے اور وہ Transvestism جیسی نفسیاتی کج روی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس نفسیاتی کج روی میں مرد خواتین کا لباس پہن کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ افسانہ "ٹی وی" کے مرد کردار "مو" سے جب راوی ملتا ہے تو اس کی حالت کچھ یوں ہوتی ہے:

"یہ میرے سامنے کون کھڑا ہے، چھ فٹ سے اوپر نکلتا ہوا قد، بلانڈ وِگ جس میں پرانی ہالی وڈ کی ایکٹرسوں کی طرح کرل پڑے ہوئے۔ گہری ڈارک اسٹک، لمبا سا اسکارٹ، ادہار جیسا ڈریس اور کمر پر ایک کمر بند اونچی ہیل والے سینڈل پہنے ہوئے وہ تقریباً آٹھ فٹ کا لگ رہا تھا۔ مجھے ایک دم لائل پور کا چھیجو ہیجڑا یاد آ گیا، مجھے شادی بیاہ میں ناچنے والے ہیجڑوں سے کتنی نفرت تھی میں انہیں مردوں کی مردانگی کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن مو کو کس زمرے میں ڈالوں۔"[۱۷]

خالد قیوم تنولی کے افسانے "برف کے باٹ" میں ژونگ کا نظریہ شخصیت پرسونا (نقاب) اور شیڈو (سایہ) کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس افسانے میں داخلی کشمکش یہاں تک پہنچتی ہے کہ اس کا کردار پروفیسر اپنی محبوبہ کی لاش حنوط کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفے بگھارنے والے پروفیسر کی شخصیت سے نقاب ہٹتا ہے تو اس کی نفسیاتی الجھن سامنے آتی ہے۔ اسی طرح خالد قیوم تنولی کے ایک اور افسانے "نارسائی کا رشتہ" کے نابینا کردار میں آٹیسٹک تھنکینگ (انتہائی تصوراتی سوچ جس سے مریض راحت محسوس کرتا ہے یعنی جاگتے میں خواب دیکھنا) اور فینٹسی جیسی نفسیاتی پیچیدگی سامنے آتی ہے۔

افتخار نسیم کے ایک اور افسانے "پی نٹ" کے کردار میں ایڈلر کے نفسیاتی تصور کمتری الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ جس کو برتری میں بدلنے کے لیے وہ شراب پی کر کلب میں روز جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح افسانہ "آخری قسط" کے کردار میں پیپر افیلیا پایا جاتا ہے۔ اس کو اردو میں تاک جھانک کہا جاتا ہے۔ کسی کو چھپ کر دیکھنے سے یا ننگا دیکھنے سے جنسی تسکین حاصل کی جاتی ہے۔

اکیسویں صدی کے افسانے میں جہاں موضوعات و ہیتوں کے لحاظ سے بڑا تنوع ملتا ہے وہاں کرداروں کے ذہنی امراض بھی کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ شائی زوفرینیا بھی انہی نفسیاتی امراض میں سے ایک ہے جس کا رجحان اکیسویں صدی کے افسانے میں کثرت سے ملتا ہے۔ فیصل عجمی کا افسانہ "ہنی مون" شائی زوفرینیا کے شکار نوجوان کی المناک انجام کی کہانی ہے۔ جس نے دیار غیر میں پیپر میرج کی تھی اور وہ خاتون اُس کو چھوڑ کر چلی گئی اس نے بازار سے اُسی قسم کی ایک پلاسٹک خاتون آرڈر پر تیار کرائی اور وہ المناک موت سے دوچار ہوا۔ اُن کا ایک اور افسانہ "ورجن ممی" بھی شائی زوفرینیا پر مبنی ہے جس کے کردار کو ڈیلوژن ہوتا ہے۔ افتخار نسیم کا افسانہ "پانچویں سمت" بھی ازدواجی زندگی کا موضوع لیے ہوئے ہے۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیوی شدید ڈیپریشن کا شکار ہے اور اولاد کی شدید خواہش رکھنے والا شوہر شائی زوفرینیا کا شکار ہو جاتا ہے اور اُسے ڈیلوژن ہوتی ہے اور ساتھ ہی ایک اور نفسیاتی بیماری اینورگزیا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ نفسیاتی کیفیت ہے جس میں بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایمبویلنس (کسی چیز کے لیے

بیک وقت متضاد جذبات رکھنا)ایبزائٹی، سکوپٹوفیلیا(جنسی فعل کو سامنے دیکھ کر جنسی تسکین حاصل کرنا)ایلوژن (باہر کی دنیا میں موجود چیزوں کی غلط توجیہہ)وغیرہ بے شمار نفسیاتی پیچیدگیاں اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں ملتی ہیں۔

اکیسویں صدی کا افسانے کے تکنیک اور اسلوب پر بھی نفسیات کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔اس دور کے افسانے میں فلیش بیک تکنیک، شعور کی رو،راوی کی تکنیک، داخلی خود کلامی اور بیانیہ تکنیک کا استعمال بکثرت ملتا ہے کہیں پر بیک وقت دو تکنیکوں کا امتزاج ملتا ہے۔اس ضمن میں اکیسویں صدی کے بیشتر افسانہ نگاروں، ،حمید شاہد، مبین مرزا، منشایاد، خالدہ حسین ،طاہرہ اقبال، محمد امین الدین، فیصل عجمی، نیئر اقبال علوی ،ناصر عباس نیئر، حمید اختر، خالد قیوم تنولی، شاہین کاظمی، ،سید زبیر شاہ سمیت دیگر افسانہ نگاروں کے افسانوں کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سلیم اختر ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳، ص ۷

۲۔ سلیم اختر ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵، ص ۱۷۰

۳۔ خالد محمود سانٹیہ، "اکیسویں صدی میں اردو افسانے کے نئے موضوعات" سہ ماہی ادبیات، پاکستان، اکادمی ادبیات، ڈائمنڈ جوبلی نمبر (جلد اول)ص، ۲۵۰

۴۔ نیئر اقبال علوی، جہانِ رنگ وبُو، لاہور، ملٹی میڈیاافیرز ۲۰۰۳ء، ص ۱۷

۵۔ ایضاً، ص ۳۱،

۶۔ محمد حمید شاہد، آدمی، فیصل آباد، مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۵

۷۔ محمد حامد سراج، برادہ، لاہور، پبلشنگ ہاؤس یونیورسٹی آف منیجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، ۲۰۱۸ء، ص ۴۷

۸۔www.uap.org

۹۔ مبین مرزا، اکیسویں صدی میں جدید افسانے کے تخلیقی نقوش مشمولہ سہ ماہی ادبیات، شمارہ نمبر ۱۳۹۔۳۰ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲، ص ۱۳۹

۱۰۔ شموئل احمد، عنکبوت، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۰، ص ۷

۱۱۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴، ص ۱۰۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۳۔ طارق ہاشمی، خوف کے کتبے اور پتھرائی ہوئی آنکھیں مشمولہ "خوف کے کتبے، زبیر شاہ سید، فیصل آباد، مثال پبلشرز امین پور بازار، ۲۰۱۱، ص ۱۱

۱۴۔ شہناز شورو، زوال دکھ، فیصل آباد، مثال پبلشرز امین پور بازار، اگست ۲۰۰۵، ص ۲۵

۱۵۔ امجد طفیل، مچھلیاں شکار کرتی ہیں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۷، ص ۱۱۵

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تین بڑے نفسیات دان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۶۴

۱۷۔ افتخار نسیم، شبری، لاہور، حارث بکس، اشاعت چہارم ۲۰۰۹، ص ۱۰۸